© rasailojaraid.com

مولانا محمد حنیف ندوی

اسلامی فلسفہ کی فکرِ نو

[مولانا محمد حنیف ندوی کا خطبہ صدارت جو انھوں نے فلسفہ کانگرس کے چوبیسویں سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور یونیورسٹی میں بتاریخ ۱۹، ۲۰، ۲۱ مئی ۱۹۸۴ ارشاد فرمایا]

خواتین وحضرات !

میرے ذہن میں جب احیائے اسلام کا تصور ابھرتا ہے تو دو چیزیں سطح ذہن پر دمک اٹھتی ہیں - پہلی یہ کہ ہمیں ایک ایسی فقہ، ایسے نظام حیات اور اسلوبِ زیست کی شیرازہ بندی کرنا ہے جو نہ صرف ہماری معاشی و اجتماعی مشکلات کو بطریقِ احسن حل کر سکے، بلکہ اس میں اصولِ اجتہاد کی ایسی تازہ کاریاں اس ڈھب سے بروئے کار لائی جائیں کہ ہماری یہ فقہ پوری انسانیت کی فقہ بن جائے۔

دوسری اس سے بھی زیادہ اہمیت کی حامل شئی یہ ہے کہ موجودہ مادی تہذیب، مادی علوم اور مادی رجحانات نے جن تیکھے اور غور طلب سوالات کو بساطِ بحث پر بکھیر دیا ہے، ان کے مقابلے میں ہم اپنے فکری و اسلامی موقف کو متعین کریں، نکھاریں، اور اس ڈھنگ سے اس کو واضح کریں کہ موجودہ دور کی عقلی سطح پر یہ ہر طرح قابل پذیرائی ہو۔ فکر و تدبر کی اسی سعی و کوشش کو فلسفہ کہتے ہیں - یہ بات درست ہے کہ فنی لحاظ سے اس کی کوئی جچی تلی تعریف بیان نہیں کی جا سکتی - لیکن جہاں تک اس کے تاریخی پس منظر کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر ہر دور میں جب بھی کسی معاشرہ میں معروضی حالات نے کچھ سوالات اور الجھاؤ پیش کیے، اہل دانش و خرد نے ہمیشہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی مقدور بھر کوشش کی - معقول سوال (INTELLIGENT QUESTION) اور معقول جواب (INTELLIGENT ANSWER) کے تسلسل ہی سے فلسفہ نکھرتا اور متعین ہوتا ہے - اس وضاحت سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف وہی سوالات درخور اعتنا اور جواب طلب ہوتے ہیں جو تاریخ کے کسی موڑ میں معروضی حالات پیدا کرنے کا موجب ہوتے ہیں، کیونکہ ایسا بھی ہوا ہے کہ تاریخی تقاضوں سے قطع نظر کچھ سوالات کسی نہ کسی طرح بساطِ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بحث پر لڑھک کر آگئے ہیں اور انھوں نے ایسی تکنیکی اہمیت اختیار کر لی ہے کہ ان کا جواب دیئے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً کلیات (UNIVERSALS) جزئیات (PARTICULARS) میں انعکاس پذیر ہوتے ہیں یا نہیں، ایک سوال ہے جو افلاطون کے نظریۂ مثل سے ابھرا اور صدیوں تک زیر بحث رہا۔ اس کے جواب میں تین مستقل مدرسہ ہائے فکر پیدا ہوئے۔

۱۔ تخیل پسند (CONCEPTAULIST)

۲۔ حقیقت پسند (REALIST) اور

۳۔ اسمیت پسند (NOMINALIST)

جواب کی ان نوعیتوں سے مابعد کے فلسفیانہ مدارس فکر خاصے متاثر ہوئے۔ اسی طرح حرکت کے ضمن میں زمان و مکان کی بحث نے خاصی گہما گہمی پیدا کیے رکھی، اور آج بھی یہ بحث حسب سابق زندہ اور غیر فیصل شدہ حقیقت تسلیم کی جاتی ہے۔

بہرحال کہنا یہ ہے کہ جو سوال بھی کسی نہ کسی سبب سے ذہنوں میں ابھر آئے، وہ جواب چاہتا ہے، اور حل و کشود پر قادر دانش وروں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اس کے بارے میں سوچیں اور اس سے نمٹنے کی کوشش کریں جہاں تک ماضی کا تعلق ہے ہم بغیر کسی اعتذار کے کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے پیش آمد سوالات کا جواب دیا۔ جب یونانی فلسفے کے ہمارے ہاں ترجمے ہوئے، دوسری اقوام کی تہذیبی اقدار سے ہماری مڈبھیڑ ہوئی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قرآن حکیم نے جو غور و فکر اور تفکر و تدبر کی دعوت دی تھی، اس کو اس کے منطقی نتائج تک پہنچانے کا وقت آیا تو ہم نے بلا محابا فکر و تعقل کی وادیوں میں گام فرسائی کا تہیہ کر لیا، اور اس کے نتیجے میں دو واضح گروہ ابھر کر ہمارے سامنے آئے۔

۱۔ متکلمین اور

۲۔ حکما

متکلمین میں معتزلہ پیش پیش تھے، معتزلہ نے یہ بیڑا اٹھایا کہ یونانی فلسفہ اور اسلامی عقاید میں تطبیق کی راہیں ڈھونڈلی جائیں۔ ان کے غور و فکر کا محور جو مسائل بنے، ان کا زیادہ تر تعلق مسئلۂ صفات، جبر و قدر، خلق قرآن سے تھا۔ یہ عقلیات میں ارسطو کی عقلیات کے تابع رہے۔ یہی وجہ ہے ان کے دلائل و براہین میں اعت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رنگ غالب ہے اور وہ تمام غلطیاں اور الجھاؤ جو ارسطو کے صغریٰ و کبریٰ پر مبنی نظامِ استدلال کی خصوصیات تھیں، ان کے علم الکلام میں بھی منعکس ہوئیں۔ ان کی ناکامی کے دو بڑے سبب تھے۔ ایک یہ کہ ان کی فکری تگ و دو میں ایمان اور کردار کی استواریوں کی جھلک بہت کم دکھائی دیتی تھی۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے اپنے مشن کی نشر و اشاعت کے لیے دلیل و عقل سے زیادہ شخصی حکومتوں کا سہارا لیا، اور جب ان حکومتوں نے ان کی سرپرستی کرنے سے انکار کر دیا تو یہ قریب قریب ختم ہو گئے۔

علاوہ ازیں ان کے زوال پذیر ہونے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ فقہا اور محدثین نے ان کے خلاف ایک مضبوط محاذ قائم کر لیا اور اس محاذ کی خاطر انھوں نے قید و محن اور کوڑوں کی سزا تک کو انگیز کیا، اور اس میں ثابت قدم رہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فکر و تعقل کے میدان میں جو انھوں نے قدم بڑھایا تھا، ان کے زوال کے ساتھ اس کے اثرات بھی ختم ہو گئے۔ ان کے بعد پورے عالمِ اسلامی میں فکر و اندیشے کی جو شمعیں فروزاں رہیں ان میں ان کی کاوش ہائے فکری کو بڑا دخل رہا ہے۔ مفتی عبدہٗ، مولوی چراغ علی اور سرسید اسی تحریک کے نتیجے میں ابھرے تھے اور اسی کے فیض یافتہ تھے۔

جوابِ آں غزل کے طور پر معتزلہ کے مدمقابل اشاعرہ نے کارزارِ فکر و تعقل میں خم ٹھونک کر قدم رکھا۔ اشاعرہ کے مدرسۂ فکر نے جوینی، اشعری اور غزالی ایسی قد آور شخصیتیں پیدا کیں۔ جوینی اور اشعری نے جس علم الکلام کی داغ بیل ڈالی تھی، غزالی نے اُسے پروان چڑھایا۔ یونانی تہذیب کے دو ناقابلِ تسخیر قلعے تھے، منطق اور فلسفہ۔ غزالی نے تہافت الفلاسفہ لکھ کر ان میں ایک کو پاش پاش کر دیا۔

غزالی کے اس اندازِ تنقید کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں کہ اس سے اندیشۂ فکر کی رفتار متاثر ہوئی یا اس سے سوچ کی کچھ نئی راہیں کھلنے کے امکانات پیدا ہوئے۔ لیکن یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس تنقید سے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ پہلی دفعہ اعتذار پسندی کی دیواریں گریں اور یونانی فکر کا کھوکھلا پن کھل کر اہلِ نظر کے سامنے آیا۔ ائمہ اعتزال کے برعکس جہاں ائمہ اشاعرہ کی پاک بازی، کردار کی استواری اور ولولۂ اسلام کی فراوانی نے ہر ایک سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہاں یہ ماننا پڑے گا کہ فکر و تعقل کی وہ طرفہ طرازیاں ان کے ہاں پائی نہیں جاتیں، جن کا معتزلہ کے ہاں چلن ہے۔ اس معاملے میں ان کی کم دبی ہوئی نظر آتی ہے، اور اس کا ثبوت ان کا یہ مشہور نظریہ ہے کہ حسن و قبح یا خیر و شر کی اساس عقل و فہم نہیں حکمِ شرع پر مبنی ہے۔ یہ اندازِ استدلال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سراسر حرفیت پسندی (LITERALISM) کا کرشمہ ہے، جن کو انھوں نے عموماً کلامی مسائل کے حل و کشود کے سلسلے میں اختیار کیا ہے۔

اس مرحلے پر ناانصافی ہوگی اگر ہم ان ساہ نوسددں کا ذکر نہ کریں جو ہر چند محدثین کے حلقۂ فکر کے پرورد ہ ہیں، تاہم ان کی فکری و تجدیدی کوششیں اس درجہ اہمیت کی حامل ہیں کہ ہر گروہ نے ان کی تعریف کی ہے ہماری مراد علامہ ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد رشید ابن القیم سے ہے۔ ابن تیمیہ نے "الرد علی المنطقیین" لکھ کر اس دوسرے قلعے کو ریزہ ریزہ کر دیا جو غزالی کے ہاتھوں بچ رہا تھا۔

ابن القیم نے قانون و فقہ کی بہت سی گتھیاں سلجھائیں اور اپنی گراں قدر تصنیف اعلام الموقعین میں فلسفۂ اجتہاد پر مکمل بحث کی۔ ان کی علمی کاوشوں سے فقہ و قانون کو ایک مربوط فکری و عقلی سانچہ ملا۔

یہ صحیح ہے کہ متکلمین اپنے اسلوب بحث و تمحیص میں مدرسیت (SCHOLASTICISM) کے دائرے سے زیادہ دور نہیں نکل پاتے لیکن ان کی بحثوں میں ایسے فکری نوادر بھی ملتے ہیں جن سے ان کی اپج (ORI-GINALITY) اور صلاحیتِ اختراع کا پتا چلتا ہے۔

حکمائے اسلام کو ہم دو خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جنھوں نے ارسطو کے علوم کو اچھی طرح سمجھا، ہضم کیا اور نکھارا اور ان پر چند متکلمانہ نتائج کی بنیاد رکھی جیسے ابن سینا اور ابن رشد۔ دوسرے وہ جنھوں نے اس راہ سے ہٹ کر فکر و ذوق کی دوسری راہیں اپنائیں۔ جیسے کندی، فارابی، ابن مسکویہ اور ابن خلدون وغیرہ۔

کندی وہ پہلا عرب فلسفی ہے جس نے ارسطو کی تمام مصطلحات کو عربی کے قالب میں ڈھالا۔ زمان و مکان پر اچھوتے انداز سے اظہارِ خیال کیا اور تخلیق و آفرینش کے اشکال کو حل کرنے کے لیے لازمان کا تصور پیش کیا۔

فارابی کی فکری خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، ابن ابی اصیبعہ اور قفطی نے خصوصیت سے اس کے مجموعۂ کمال کا اعتراف کیا ہے۔ یہ پہلا فلسفی ہے جس نے ارسطو کے ساتھ افلاطون کا بھی دقیق مطالعہ کیا اور منطق کے پہلو بہ پہلو سیاسیات اور اخلاقیات پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ المدینۃ الفاضلہ میں اس نے بتایا کہ نصب العینی (IDEAL) ریاست کے خد و خال کیا ہوتے ہیں۔ علم اور اس کے استعمال کے بارے میں اس کا یہ قول کس درجہ صحیح ہے کہ یہ کتابیں پڑھنے اور درسی کتابیں رٹنے کا نام نہیں بلکہ تکمیل و اتمام ذات کی بلند ترین چوٹیوں کو سر کرنے سے تعبیر ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن مسکویہ نے اپنے فلسفیانہ افکار میں نفس و اخلاقیات کی باریکیوں کو موضوع بحث ٹھہرایا۔ اس کے نزدیک بنیادی نیکیاں جن پر اخلاقیات کا محل تعمیر ہوتا ہے چار ہیں۔ عقل و حکمت، اعتدال و توازن، جرأت و عدل۔

ابن خلدون وہ مشہور اور عظیم فلسفی ہے، جس نے مسلمانوں میں فلسفہ اجتماعیات کا شعور پیدا کیا۔ فلسفہ، تاریخ کی طرح ڈالی اور قوموں کے عروج و زوال پر روشنی ڈالی اور اس حقیقت کا اظہار کیا کہ تاریخ اور جغرافیائی عوامل کیونکر قوموں کے تہذیبی مزاج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اس تفصیل سے ماضی میں ہمارے اسلاف نے یونانی تہذیب و ثقافت کے مقابلے میں جو کارنامے نمایاں انجام دیے ان کا خاکہ سا ضرور ہمیں معلوم ہوا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ مغربی علوم و معارف، موجودہ تہذیبی رجحانات اور موجودہ فکری دھاروں نے اگر فکر و نظر کی سطح پر کچھ سوالات اور چیلنج ابھارے ہیں، تو ہم ان کے بارے میں کیا طرز عمل اختیار کر رہے ہیں۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ اپنے اسلاف کی طرح ان علوم و معارف کی تہ تک اتریں، ان کا تجزیہ کریں، انھیں اچھی طرح جانیں بوجھیں اور یہ متعین کریں کہ ان کے ہوتے ساتے ہمارا موقف کیا ہے، ہم کہاں کھڑے ہیں اور ہمارے پاؤں تلے جو زمین ہے، اس میں کس درجہ استواری و استحکام ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب سے متعلق کئی نظریے پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ جب تک قومیں اخلاقی ضوابط کی پابند رہتی ہیں، زندہ رہتی ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ جب تک کسی قوم میں مقابلے کی صلاحیتیں زندہ رہتی ہیں، وہ زندہ ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ارتقا نے اس نظریے کو جنم دیا ہے کہ قوموں کی زندگی اس امر پر موقوف ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ان کو کس درجہ رسوخ حاصل ہے۔

یہ سب نظریے اپنے آغوش میں کوئی نہ کوئی صداقت لیے ہوئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ کیا قوم اس دور کے تقاضوں سے آشنا ہے؟ اس دور کے سوالات سے کام ہے، اور اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ اس کا اپنا فلسفہ حیات کیا ہے؟ ہمارے نزدیک ایسے فلسفہ حیات کا شعور ہی کسی قوم کی زندگی کے لیے لازمی ہوتا ہے جس کو وہ اپنا فلسفہ کہہ سکے۔

لہٰذا اگر ہم مسلمان کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہمارا اپنا فلسفہ ہو، اپنا فکر ہو اور اپنا انداز فہم و تعبیر ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یوں تو ہر فلسفہ اپنا ہے۔ جہاں کوئی سلیقے کی بات ہوتی ہے، جہاں فلسفۂ حیات کے کسی گوشے سے پردہ سرکا ہے اور کسی نئی حقیقت کا انکشاف ہوا ہے یا کائنات کے بارے میں کسی تازہ روشنی نے ہمیں مستنیر کیا ہے، ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ سب اپنا ہے، ہر سچائی اپنی ہے اور ہر اچھی چیز اپنی ہے۔

اپنے فلسفے سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم اپنے طور پر بھی کائنات کے اسرار کا مطالعہ کریں اور اس مطالعے سے جو نتائج سامنے آئیں وہ ہمارے اپنے اخذ کردہ ہوں، دوسروں کی دریوزہ گری کے مرہون منت نہ ہوں۔

ہم جب اپنے فلسفہ یا اسلامی فلسفہ کی تعمیر نو کا نام لیتے ہیں تو علاوہ اس کے کہ اس میں ہم اپنے اخذ کردہ نتائج پر بھروسہ کریں، یہ چیز بھی داخل ہے کہ کائنات اور اس کی تسخیر کے متعلق زندگی، اور اس کے تسلسل کے بارے میں یا دوسرے مابعد الطبیعی حقائق کے اعتراف و اذعان کے سلسلے میں پہلے ہی قدم پر ہمارا ذہن صاف ہو۔

مسئلہ اجتہاد : مولانا محمد حنیف ندوی

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ جہاں یہ بتاتا ہے کہ توحید کیا ہے، دلوں میں ایمان کے داعیے کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ تقوی کیسے ابھرتا ہے اور کردار اور سیرت کی تشکیل کیونکر ممکن ہے، وہاں اس میں اس بات کا پورا پورا اہتمام بھی پایا جاتا ہے کہ بدلتے ہوئے اجتماعی حالات میں احکام و مسائل کی کیا شکل ہو، یعنی وہ کون سے اصول اور پیمانے ہیں جن پر قیاس اور اجتہاد کا قصر رفیع تعمیر ہوتا ہے۔ "مسئلہ اجتہاد" میں ان فقہی بنیادوں اور پیمانوں کی تشریح کی گئی ہے جن کی روشنی میں فقہ جدید کی تدوین کا مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔

صفحات ۱۹۲ قیمت ۸ روپے

ملنے کا پتا ، ادارۂ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

© rasailojaraid.com